© rasailojaraid.com

محمد حنیف ندوی

احیائے اسلام اور اس کے تقاضے

(۳)

علم و دانش کے نئے نئے رجحانات نے عقائد و افکار میں کیا کیا تبدیلیاں پیدا کیں، کن کن شکوک کو جنم دیا اور اسلوب و استدلال کے اشہب تیز رفتار نے کن کن پُرپیچ راستوں پر گام فرسائی کی اسے آپ دیکھ چکے۔ اب یہ دیکھنا باقی ہے کہ عصر حاضر کی طرفہ طرازیوں نے کن جدید تہذیبی اشکالات کی نشاندہی کی ہے اور اس کے مقابلہ میں ہمارا کیا موقف ہونا چاہیے۔

اس سلسلہ میں ہمارے سامنے تین متعین عنوان آتے ہیں جن پر ہمیں پوری طرح غور و فکر کرنا ہے،

(۱) موجودہ ترقی پذیر معاشرہ میں عورت کے فرائض، درجہ اور منصب کی تعیین۔
(۲) سائنس اور ٹیکنالوجی نے جن نئے مسائل کو ابھار دیا ہے ان کا کیا حل ہے؟
(۳) اسلام کا اقتصادی نظام کس نوع کے معاشرہ کی تشکیل چاہتا ہے۔

یہ وہ اہم عنوان ہیں جن کو واضح کیے بنا ہم کسی تہذیبی و تمدنی نقشہ کو ترتیب نہیں دے سکتے۔ اس سے پہلے کہ ہم ایک ایک عنوان پر اظہار خیال کریں، یہ ضروری ہے کہ ہم اختصار کے ساتھ اس سوال سے نمٹ لیں کہ ان مسائل پر بحث و تمحیص کرتے وقت ہمارے سامنے معیار کیا ہوگا۔ کیا صرف ماضی اور زمانہ گذشتہ کی روایات، یا حال اور مستقبل اور موجودہ افکار و نظریات۔

اس میں شبہ نہیں کہ تہذیب انسانی کو کن بنیادوں پر استوار ہونا چاہیے؟ ایسا ٹیڑھا سوال ہے جس کا دوٹوک جواب دینا آسان نہیں۔ لوگوں نے اس بارہ میں دو مستقل نظریے اختیار کیے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک گروہ کی یہ رائے ہے، ہمیں صرف ماضی کی طرف دیکھنا چاہیے۔ ماضی میں کردار وعمل کی جو عظمتیں پائی گئی ہے، سادگی کا جو نکھار ہے یا فطرت سے قریب تر رہنے کی وجہ سے لطف وکیف کے جو مزے ہیں ان کی مثال حال یا مستقبل کی بے راہ روی اور تکلف سے معمور زندگی میں ملنا مشکل ہے۔

دوسرا گروہ دیانت داری سے یہ سمجھتا ہے کہ ہمیں صرف حال اور مستقبل کے تقاضوں کو مدنظر رکھنا چاہیے۔ ان کے نقطۂ نظر سے ماضی کا آفتاب اپنی تمام تر جلوہ آرائیوں کے ساتھ غروب ہو چکا ہے لہٰذا اس کے ساتھ وہ روایات، پیمانے اور زندگی کا نہج بھی اپنی افادیت کھو چکا ہے جس کا اس دور سے تعلق تھا۔ آج کے افق پر آفتاب تازہ ضوفشاں ہے اور زمین سے آسمان تک انسانی فکر انسانی دانش اور انسانی عظمت کے جھنڈے گڑے ہیں۔ اس بنا پر اگر ہمیں کسی زندہ، روشن اور جاندار تہذیب کی پرورش کرنا ہے تو ضروری ہے کہ ہم مستقبل کی ترقیات پر نگاہ رکھیں اور اس کی اور صرف اس کی روشنی میں حال کے نقشوں کو ترتیب دیں۔

ہماری رائے میں یہ دونوں رائیں جادۂ اعتدال سے ہٹی ہوئی ہیں۔ نہ ماضی بے کار اور غیر مفید ہے اور نہ حال ومستقبل کے تقاضے غیر ضروری ہیں۔ آخر ہم اس ماضی سے کیونکر دست بردار ہو سکتے ہیں جس نے ہمیں زندگی کا ابتدائی درس دیا ہے، جس نے پہلے پہل آئین اور قانون کے ضابطے مقرر کیے ہیں۔ جس نے ہمیں کردار وسیرت کی عظمتیں بخشی ہیں۔ جس نے ہم تک وحی والہام کی تابشیں پہنچائی ہیں۔ جس نے باطن کو نکھارا اور روح کو سنوارا ہے۔ جس نے ہمیں عقیدہ وایمان کی استواریوں سے بہرہ مند کیا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جس نے انسان اور اس کے پروردگار کے مابین رشتہ و تعلق کی نوعیتوں کو واضح کیا ہے اسی طرح ہم اس حال کو کیونکر نظر انداز کر سکتے ہیں جس میں نہ صرف ہم رہ رہے ہیں بلکہ جس نے علم وہنر کے گیسوئے تابدار کو اور تابدار بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ جس نے سائنس اور ٹیکنالوجی کے ان عظیم اور محیر العقل خوارق کو حس ومشاہدہ کی سطح پر ابھارا ہے۔ جن پر نوع انسانی ہمیشہ فخر وناز کرتی رہے گی۔ جس کی علمی تگ وتاز کے دائرے زمین سے بلند ہو کر آسمان کی وسعتوں کو چھونے لگے ہیں۔ جس نے انسانی حوصلوں اور امنگوں کو جلا بخشی ہے اور انسان میں طلب وجستجو اور تحقیق وتفحص کے بے پناہ داعیوں کو بیدار کیا ہے اور پہلی دفعہ انسان کو اسرار فطرت کا رازدار بنایا ہے۔ بھلا ایسے تابناک اور شاندار حال کو نظر انداز کر کے ہم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کسی عمدہ اور برتر انسانی تہذیب کا خواب دیکھ سکتے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ ہم بحیثیت مسلمان کے اس بات کے قائل ہی نہیں کہ اقدارِ حیات کے بارہ میں ماضی و حال کی اصطلاحوں میں سوچیں۔ اس لیے کہ دونوں میں خوبیاں اور فضائل ہیں اور دونوں میں کمزوریوں اور نقائص کا عمل دخل پایا جاتا ہے۔ صرف ماضی کا ہو رہنے سے تنگ نظری تعصب اور تقلید و جمود کے ابھرنے کا خطرہ ہے، اور صرف جدید کے عشق سے سطحیت، بے راہ روی اور اخلاقی ناہمواریوں کے پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ ماضی و حال دونوں سے ہمیں استفادہ کرنا چاہیے۔ لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ ان دونوں سے صرف انہی اصولوں کو لینا چاہیے جو زندہ رہنے کی صلاحیت ... ہیں جو مفید ہیں اور جن سے تہذیب و تمدن کا قافلہ آگے بڑھتا ہے۔ اور دونوں میں ان عناصر اور صورتوں سے دامن کشاں رہنا چاہیے جن میں زندہ رہنے، ترقی کرنے اور نفع پہنچانے کی صلاحیتیں پائی نہیں جاتیں۔ قرآن حکیم نے اسی حکیمانہ اصول کو اپنی زبان میں یوں بیان فرمایا ہے:

كذالك يضرب الله الحق والباطل فاما الزبد فيذهب جفاء واما ما ينفع الناس فيمكث في الارض (رعد ۱۷)

اسی طرح خدا حق و باطل کی مثال بیان کرتا ہے سو جھاگ تو سوکھ کر زائل ہو جاتا ہے اور پانی جو لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے وہ زمین میں ٹھہرا رہتا ہے۔

یعنی حق وہی ہے جس میں باقی رہنے کی صلاحیت ہے اور جسے زائل اور فنا ہونا ہے وہ حق نہیں باطل ہے۔ مفید نہیں مضر ہے۔

اس وضاحت کے بعد آیئے اب ہم ترتیب وار ان مسائل سے تعرض کریں جن کو ہم نے زیبِ عنوان ٹھہرایا ہے۔ موجودہ ترقی پذیر معاشرہ میں عورت کے فرائض کیا ہیں اور اس کے درجہ و منصب کی تعیین کیوں کر ہو؟ اس دَور کا یہ ایک اہم تہذیبی سوال یا چیلنج ہے جس سے عہدہ برآ ہوئے بغیر ہم اسلامی تصورِ حیات کی تعیین نہیں کر سکتے۔ اس کے جواب میں تین متعین اندازِ فکر اختیار کیے جا سکتے ہیں۔ ایک انداز یہ ہے کہ معاشرہ میں کسی تبدیلی کو تسلیم نہ کیا جائے، کسی تغیر سے مصالحت نہ کی جائے اور عورت کو ذہنی و اجتماعی نقطۂ نظر سے اسی درجے پر رکھا جائے جس پر وہ ہزاروں برس سے فائز ہے۔ یعنی پردہ کی پرانی شدتیں جوں کی توں قائم رہیں اور تعلیم و تربیت کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حقوق محدود اور مشروط ہوں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ تعلیم و تربیت کے دائروں کو قدرے وسعت دی جائے۔ اور پردہ کی شدتوں کو کچھ کم کیا جائے۔ یہی نہیں اس میں اس طرح کی تبدیلیاں روا رکھی جائیں کہ جن کی وجہ سے عورتوں کے لیے ضروریات کی تکمیل کے سلسلہ میں گھروں سے نکلتے وقت چہرہ کو ڈھانپنا اور چھپانا ضروری نہ رہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ عورت کو ذہنی و اجتماعی لحاظ سے ثانوی درجہ پر قانع نہ رہنے دیا جائے۔ بلکہ اس کے لیے تعلیم و تربیت، اور قومی و ملی تگ و دو کا نقشہ اس اسلوب اور ڈھنگ سے ترتیب دیا جائے کہ یہ آخر آخر میں فکر و تعقل کی اسی سطح پر فائز ہو جائے جس پر کہ آج مرد فائز ہے تاکہ مرد کی طرح یہ بھی کشاکش حیات میں پوری طرح شریک ہو سکے اور زندگی کا براہ راست تجربہ کر سکے۔

جہاں تک پہلے انداز فکر کا تعلق ہے اس کے بارہ میں کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں کیونکہ زمانہ بدلا ہے، ذہن بدلے ہیں اور معاشرہ کے اجتماعی تقاضوں میں دوررس اور بنیادی تغیرات رونما ہوئے ہیں اس بنا پر فکر کے اس نہج کو موجودہ حالات میں قطعی خارج از بحث سمجھنا چاہیے۔ دوسری صورت سے گذشتہ نصف صدی میں اکثر حضرات نے تعرض کیا ہے۔ چنانچہ قاسم امین۔ فرید وجدی۔ سرسید، ان کے رفقاء۔ مولانا مودودی۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور مالک رام وغیرہ حضرات نے اس موضوع پر اچھا خاصا لکھا ہے۔ ان کی بحث کا محور زیادہ تر یہ نقطہ رہا ہے کہ پردہ کیوں ضروری یا غیر ضروری ہے۔ اس کے حدود کیا ہیں۔ چہرہ کھلا رہے یا نہ کھلا رہے، زینت کا اطلاق کن کن چیزوں یا اعضاء پر ہوتا ہے۔ اس کے فوائد اور نقصانات کا کیا تناسب ہے۔ یا اسلامی نقطہ نظر سے پابندی یا آزادی کس حد تک گوارا یا جائز ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام بحثیں اپنی جگہ بہت اہم اور قیمتی ہیں۔ تیسرے اسلوب کے بارہ میں ان حضرات نے اپنی کتابوں اور مقالوں میں اشارات تو کیے ہیں مگر اس کو بحث و تحقیق کا مرکز قرار نہیں دیا۔ حالانکہ اصل مسئلہ جس نے تہذیب انسانی کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے یہی تو ہے کہ اس دور میں عورت کا معاشرہ میں کردار کیا ہونا چاہیے۔ اجتماعی۔ متحرک اور ترقی پسندانہ، یا غیر اجتماعی اور ساکن و جامد۔ سفور و حجاب کی بحث اس سلسلہ میں غیر فیصلہ کن اور مجمل ہے۔

بات یہ ہے کہ اس مرحلہ پر ہمیں حالات کا حقیقت پسندانہ جائزہ لینا چاہیے اور اس چیز کو تسلیم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کر لینا چاہیے کہ ہم جس دور سے گذر رہے ہیں وہ علم و فن کے انتہائی فروغ و اشاعت کا دور ہے عورتوں نے نہ صرف تعلیم و تربیت کے اہم مراحل طے کر لیے ہیں بلکہ یورپ مغرب اور اشتراکی ریاستوں میں وہ اس لائق بھی ہو گئی ہیں کہ زندگی کے تمام شعبوں میں بھرپور حصہ لے سکیں۔ اس تجربے سے ان میں جہاں خود اعتمادی بڑھی ہے اور ذہن و فکر کی سطحیں بلند ہوئی ہیں وہاں معاشرہ میں رچی بسی اس قدیم غلط فہمی کا بھی ازالہ ہوا ہے کہ عورتیں دوسرے درجہ کی مخلوق ہیں یا ان کی تگ و دو صرف گھر کی چار دیواری تک محدود رہنا چاہیے۔

ہمیں اس سلسلہ میں یہ بھی مان لینا چاہیے کہ یہ دور صنعتی تہذیب و ارتقاء کا دور ہے۔ جس میں شدید مقابلہ اور مسابقت کی روح کار فرما ہے۔ اور صنعتی تہذیب میں یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ عورتیں مردوں کے پہلو بہ پہلو فنی تعلیم اور فنی تربیت حاصل کریں اور دونوں مل جل کر ملک کی دولت بڑھانے اور معیار زیست کو ترقی دینے میں حصہ لیں۔

اس دور میں اس حقیقت سے بھی اغماض نہیں برتا جا سکتا کہ ہمارے لیے جنگ کا خطرہ حقیقی ہے۔ دشمن کسی وقت بھی ہم پر حملہ کر سکتا ہے جس کے لیے ہم کو ہر وقت چوکنا، چوکس اور تیار رہنا چاہیے بد قسمتی سے آج لڑائی کی نوعیت یہ نہیں کہ ایک مخصوص میدان وغا ہو جہاں بہادر مرد داد شجاعت دیں اور بال بچوں کی حفاظت کے لیے کٹ مریں۔ آج کی لڑائی اس کے برعکس پوری قوم کی لڑائی ہے جو دفتروں، کھیتوں، کارخانوں، کالجوں اور ان تمام اصلاحی و اجتماعی اداروں میں رہ کر اور کام کر کے لڑی جا سکتی ہے جن کا وجود ملک کے لیے ضروری ہے۔ چنانچہ آج یہ حالات ہیں کہ کوئی بھی ملک جنگ کی ہولناکیوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا اور لڑائی نہیں جیت سکتا جب تک عورتیں بھی ان تمام کاموں میں مردوں کا ہاتھ نہ بٹا سکیں اور معمول کے مطابق ان کو جاری نہ رکھ سکیں۔

ان نکات پر غور کرنے سے یہ بات نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ آج جو سوال عورتوں کے بارہ میں تحقیق طلب ہے وہ پردہ کے حدود متعین کرنے کا نہیں بلکہ صرف یہ ہے کہ آیا ہم معاشرہ میں ان کے اجتماعی کردار کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہیں یا نہیں۔ یعنی اصلاح و تغیر کا جو نقشہ بھی بنے، اس کا آغاز اس مسئلہ سے ہونا چاہیے کہ تعلیم و تربیت کے ایک خاص نہج، صنعتی تہذیب کے فروغ اور جنگ کے امکانات نے عورتوں کو نہ صرف گھروں سے نکلنے پر مجبور کر دیا ہے بلکہ ان کے ذہن اور ان کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انا میں کافی ترقی بھی ہوئی ہے، اور ان میں خود اعتمادی کے جذبات بھی بڑھے ہیں۔ اور انھوں نے اپنی روایتی محنت، سلیقہ اور قوتِ برداشت سے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ مردوں کے بالکل ساتھ ساتھ نہ سہی ان کی رہنمائی میں یہ زندگی کے ہر میدان میں کارہائے نمایاں انجام دے سکتی ہیں۔ اور یہ کہ ان کی ذہنی صلاحیتوں میں ترقی کی مزید گنجائش موجود ہے۔

لیکن دو وجہ سے ہم عورتوں کے اجتماعی کردار کو جوں کا توں اور غیر مشروط طور پر تسلیم کر لینے سے قاصر ہیں۔ ایک تو یہ محض تقلیدی فعل ہوگا، اور اس سے پہلے ہم کہہ چکے ہیں کہ ایک زندہ اور قائم بالذات تہذیب کے لیے ضروری ہے کہ اس میں تقلید کے بجائے تخلیق ہو۔ اضافہ ہو، اور اس طرح کا رد و بدل ہو جو اس کو ایک نیا روپ عطا کرے اور نئے امیتازات بخشے۔ دوسرے اجتماعی زندگی میں غیر مشروط اور مقلدانہ شرکت سے جو اخلاقی مفسدہ ابھرنے کا اندیشہ ہے وہ نہ صرف حقیقی ہے بلکہ ہمارے غیورانہ مزاج کے قطعی منافی ہے۔ اس سلسلہ میں ہمارے اور مغرب کے تہذیبی تصورات میں ایک بنیادی فرق ہے۔ مغرب عصمت و عفاف کو ایک منفی قسم کی خوبی سمجھتا ہے اور بعض حلقوں میں تو سرے سے اس کو خوبی ہی نہیں سمجھا جاتا۔ ان کے نزدیک فسق و فجور کا مسئلہ بالکل ذاتی یا جسمانی ہے۔ عام اخلاقیات سے اس کو کوئی تعلق نہیں۔ لیکن ہمارے نقطۂ نظر سے صورتِ مسئلہ یہ نہیں۔ ہم عفاف اور جنسی پاکیزگی کو عورت کا اصل جوہر سمجھتے ہیں۔ مثبت خوبی قرار دیتے ہیں اور ایسی ناگزیر اور بنیادی قدر مانتے ہیں کہ جس پر ازدواجی کامیابیاں اور قلب و روح کا اطمینان و سکون موقوف و منحصر ہے۔ مغرب اور ہم میں مذاق کا بڑا فرق ہے۔ وہ ایک عورت میں صرف علم و ہنر کی خوبیاں دیکھتا ہے، اور یہ دیکھتا ہے کہ وہ کس درجہ شوخ، چنچل اور دلفریب شخصیت کی مالک ہے۔ یا کس حد تک دلوں کو موہ سکتی اور بڑوں بڑوں کو اپنے گیسوؤں کا اسیر بنا سکتی ہے۔ ہمارے ہاں علم و ہنر کے پہلو بہ پہلو یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ یہ حیا و عفاف کی دولت سے بھی بہرہ ور ہے یا نہیں قرآن حکیم میں مسلمان عورت کے جو خد و خال بیان کیے گئے ہیں، اس میں عفاف و پاکیزگی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے،

فالصلحت قنتت حفظت للغیب بما حفظ اللہ (نساء ۳۴)	سو جو نیک بیبیاں ہیں وہ مردوں کا کہنا مانتی ہیں۔ اور ان کی غیر حاضری میں عزت و آبرو اور مردوں کے مال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی حفاظت کرتی ہیں۔

ان حالات میں ان مفکرین اسلام کے سامنے جو اسلامی تہذیب و ثقافت کا احیاء چاہتے ہیں دو واضح تقاضے ہیں۔ ایک تقاضا عصری ضرورتوں کی بنا پر یہ ہے کہ عورتوں کو تعلیمی، وطنی یا اجتماعی ماحول میں شریک ہونے کے جو مواقع میسر ہیں ان کو ختم نہ کیا جائے، نہ ان کو ختم کر دینے کے امکانات ہی ہیں۔ بلکہ اس بارہ میں ان کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی کی جائے۔

دوسرا تقاضا اسلامی نقطۂ نظر سے یہ ہے کہ اس کے ساتھ ایسے تحفظات کا اہتمام کر لیا جائے جس سے اخلاقی مفاسد کا نہ صرف سدباب ہو سکے بلکہ تہذیب و تمدن کا یہ جزو ترکیبی بجائے بگاڑ کے معاشرہ میں صحت مند اسلامی تبدیلیوں کا باعث بنے اور نئی روایات کی طرح ڈال سکے یعنی عورتیں گھروں سے نکلیں تو بزم آرائی یا انجمن آرائی کے لیے نہیں بلکہ ملی و اجتماعی نصب العین کے لیے۔ یہ تحفظات کس نوعیت کے ہوں بس اسی نقطہ کی وضاحت و تعیین پر اس سوال کا صحیح صحیح جواب موقوف ہے۔

ایک اہم اور توجہ طلب مسئلہ یہ بھی ہے کہ مغرب کی لذت ایجاد نے سائنس اور ٹکنالوجی کی مدد سے جن مشینوں اور آلات کو پیدا کیا ہے انھوں نے نئے نئے مسائل اور نئے نئے اشکال کی بھی تخلیق کی ہے۔ چنانچہ فوٹوگرافی، سینما اور ٹیلی ویژن اسی ذوق اختراع اور لذت ایجاد کا نتیجہ ہیں۔ ان مسائل نے ہمارے حلقوں میں نئی بحثیں چھیڑ دی ہیں۔ کیا فوٹوگرافی جائز ہے، سینما دیکھنا درست ہے؟ اور ابھی ہم ان دو مسئلوں کا فیصلہ بھی نہیں کرنے پائے تھے کہ ٹیلی ویژن نے ان دونوں کو ہمارے گھروں میں پہنچا دیا۔ اب ہم حیران ہیں کہ کیا کریں کیا نہ کریں۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ صنعت و حرفت کے ارتقاء اور علوم و فنون کے فروغ نے اس طرح کے بیسیوں نئے سوال ابھار دیے ہیں۔ جن کا اگر حل نہ سوچا گیا یا اسلامی معاشرہ میں ان کی ٹھیک ٹھیک جگہ نہ متعین کی گئی تو خطرہ ہے کہ ہمارا معاشرہ سخت گڑبڑ کا شکار ہو کر رہ جائے گا۔ جس سے نہ تو وہ فوائد حاصل ہوں گے جو حاصل کیے جا سکتے ہیں اور نہ ہماری تہذیب و ثقافت ہی کوئی واضح شکل اختیار کر سکے گی۔

اس طرح کے مسائل کو کیونکر حل کرنا چاہیے۔ اس سلسلہ میں ہم سر دست اصولی حد تک ہی کچھ کہنے کے مجاز ہیں۔ تفصیلات کیونکر طے ہوں۔ اس سوال کا جواب ہم مضمون کے آخر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں دیے گئے۔ یہاں دراصل چار نکات فیصلہ کن عنصر کی حیثیت سے غور و فکر کے لیے پیش کیے جا سکتے ہیں،

۱۔ کیا یہ ممکن ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے موجودہ ارتقا کو روک دیا جائے۔ انسان کے ذوق تخلیق پر پہرے بٹھا دیے جائیں اور ایسی ایجادات و انکشافات کو معرض وجود میں آنے ہی نہ دیا جائے جو ہمارے تصورات دینی سے متصادم ہوں۔

۲۔ اگر ایسا ہونا ممکن نہیں ہے اور قطعی ممکن نہیں ہے تو پھر کیا ہم ان ایجادات کو اسلامی سانچوں میں نہیں ڈھال سکتے اور ان سے اسلامی اقدار کی اشاعت و فروغ کا کام نہیں لے سکتے۔

۳۔ اسلام میں "تفریحات" کا کیا درجہ ہے؟

۴۔ کیا "تفریحات" صرف تفریحات یا لہو و لعب ہیں یا ان سے تعلیم و تربیت، اور فکر و ذہن کی آسودگی اور نشاط آفرینی کے فوائد بھی حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

اس عہد کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اسلامی نظام اقتصادیات کس نوع کے معاشرہ کی تخلیق کا حامی ہے۔ بات یہ ہے کہ اس وقت، دو واضح نظام حیات پائے جاتے ہیں۔ ایک سرمایہ دارانہ نظام ہے اور ایک اشتراکی نظام۔ دونوں اپنے مزاج، فطرت اور اثرات کے اعتبار سے متعین ہیں۔ اول الذکر تصور نے سرمایہ کو چند خاندانوں میں محصور کر دیا ہے۔ استحصال کو جنم دیا ہے اور وہ صورت حالات پیدا کر دی ہے جسے افلاطون ایک ہی شہر میں دو شہروں سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی ایک ہی ملک و ملت میں ایک بالاتر مخلوق ہے جس کی تہذیب الگ ہے، اخلاقی پیمانے جدا ہیں، اور جو سب سے پہلے ایک برادری ہے جس کا ایک متعین مفاد ہے۔ جسے ضروریات کے علاوہ تعیشات کی فراوانیاں تک میسر ہیں۔ اور دوسری ادنیٰ مخلوق ہے جو تہذیب و تمدن اور اپنے روحانی و اجتماعی معیاروں کے اعتباروں سے اس سے بالکل مختلف ہے اور زندگی کی ابتدائی ضروریات تک سے محروم ہے۔

اس نظام کی بدولت انسان اور انسان میں درجہ و منصب کے عظیم فاصلے حائل ہیں۔ اس نظام زیست میں ذہانت، کارگذاری اور کردار کا کوئی مقام نہیں۔ اصل مقام سرمایہ کو حاصل ہے۔ یعنی معاشرہ میں شرف و بزرگی کا اہل وہ نہیں، جو فکر و عمل کی غیر معمولی صلاحیتوں سے بہرہ ور ہے، جو معاشرہ کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ یا جو معاشرہ کی زیادہ سے زیادہ خدمت بجا لا سکتا ہے۔ بلکہ اہل وہ ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جس کے پاس سرمایہ کی ریل پیل ہے اور سیم و زر کے انبار ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام میں تضاد یہ ہے کہ یہ بیک وقت دونوں طبقوں کو خوش رکھنے کا مدعی ہے زرداروں کو بھی اور غریبوں کو بھی۔ لیکن اس کی اصل حمایت کے حق دار صرف زردار ہی ہیں۔ اس میں بظاہر کچھ خوبیاں بھی ہیں۔ اس میں فرد نسبتاً زیادہ آزاد ہے۔ کاروبار کی کھلی آزادی ہے۔ خیالات و افکار کی اشاعت پر پابندیاں کم ہیں۔ اور ہر جماعت کو تنظیم اور کام کے مکمل جمہوری حقوق حاصل ہیں وہ چاہے کسی فلسفہ کو اپنائے، کسی نقطۂ نظر کو اختیار کرے، اور کسی تہذیبی تصور سے عقیدت و وابستگی کا اظہار کرے یہ نظام اس سے قطعی بازپرس نہیں کرتا۔ یہ خوبیاں ہمارے نزدیک بظاہر ان معنوں میں خوبیاں ہیں کہ ان تمام آسائیوں سے زیادہ سے زیادہ استفادہ وہی گروہ کر سکے گا جس کے پاس سرمایہ ہوگا، دولت ہوگی اور جو عملاً پورے نظام اقتصادیات پر چھایا ہوا ہوگا۔ وہی کاروبار کے دائروں کو پھیلا سکے گا اور وہی اجارہ داری پیدا کر سکے گا۔ اسی کے افکار و خیالات پریس میں چھپیں گے اور اخبارات و مجلات کی زینت بنیں گے۔ اور وہی اس لائق بھی ہوگا کہ کسی تنظیم کی طرح ڈال سکے یا اس کی پرورش کر سکے۔ اس نقارخانہ میں بھلا غریب و نادار طوطی کی کون سنتا ہے؟ لیکن اس کے باوجود ہم کہیں گے کہ جمہوریت بجائے خود ایک زریں اصول ہے۔ ایک صحت مند عقیدہ ہے اور ایک ایسا نصب العین ہے جس کو اجتماعی تنظیم کی ہر ہر سطح پر جلوہ گر ہونا چاہیے۔

اشتراکی نظام اس کے برعکس اجارہ داری اور استحصال کی تمام صورتوں کا قلع قمع کرتا ہے۔ تہذیب و تمدن کی دوئی اور ثنویت کو دور کرتا ہے، اور انسان اور انسان کے مابین جاہ و مرتبہ کی جو اونچی اونچی دیواریں حائل ہیں ان کو دور کرنے اور گرا دینے کا مدعی ہے۔ اس نظام زیست میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں تگ و دو کا محور جلب منفعت نہیں رہتا بلکہ اس کی جگہ قومی و ملی نصب العین لے لیتا ہے، اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان کی عظمت کا اندازہ اس سے نہیں لگایا جاتا کہ اس کی مالی حالت کیا ہے بلکہ اس سے لگایا جاتا ہے کہ اس کی ذہنی صلاحیتیں کس درجہ فائق ہیں، اور یہ اپنے علم و ہنر سے معاشرہ کو کس حد تک بہرہ مند کر سکتا ہے۔ اس نظام حیات کے بارہ میں مغرب کے مفکرین کا ردعمل پہلے تو یہ تھا کہ یہ ایک خواب ہے، یا مجنون کی بڑ ہے، جو ہرگز عملی صورت اختیار کرنے والی نہیں۔ لیکن اب یہ نہ صرف ایک جیتی جاگتی حقیقت بن گئی ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بلکہ مغربی تہذیب و تمدن اس کو اپنے لیے ایک عظیم خطرہ بھی محسوس کرتا ہے۔ علاوہ ازیں روس، چین اور مغرب کی متعدد ریاستیں اس نظریہ حیات کی استواریوں کا زندہ ثبوت بھی ہیں۔ لیکن غور کیجیے تو ان خوبیوں کے ساتھ اس میں دو بڑے عیب بھی ہیں جو کسی طرح بھی ناشائستہ التفات نہیں ایک تو اس کی اساس جدلی مادیت (Dialectical Materialism) کے اصول پر قائم ہے جس کے ساتھ مسلمان کی حیثیت سے کوئی سمجھوتہ یا تعاون ممکن نہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں اور دیانت داری سے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ عالم ہست و بود آپ سے آپ وجود میں نہیں آیا ہے اور نہ اپنے وجود میں کسی جدلی اور مادی طریق کار کا رہین منت ہی ہے۔ بلکہ اس کو پیدا کرنے والی ایک بلند تر ذات ہے جو علم، قدرت اور حکمت کی بے پناہیوں سے متصف ہے۔

دوسرے اس میں جبر و استبداد کی گھٹن اس درجہ زیادہ ہے کہ اس میں "فرد" کے لیے تگ و تاز اور سعی کا میدان بالکل تنگ ہو کر رہ جاتا ہے۔ حالانکہ فرد و اجتماع میں رشتہ و تعلق کی نوعیت اس اصول پر مبنی ہونا چاہیے کہ نہ تو فرد حد سے بڑھی ہوئی اجتماعیت کے بھینٹ چڑھے اور نہ اجتماعی مصلحتوں کو فرد کی بے راہ روی پر قربان کیا جائے۔ اس سلسلہ کا اہم سوال یہ ہے کہ ان دونوں نظاموں کے موازنہ کے بعد ایسا کون نظام ہو سکتا ہے جس میں سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکی نظام کی خوبیوں کو اس طرح جذب کیا جا سکے، اور اس طرح اسلامی معاشرہ کا جزو بنایا جا سکے کہ اس تغیر اور جذب کے بعد وہ اپنے مزاج، روح اور شکل کے اعتبار سے بالکل اسلامی ہو۔

یہاں یہ نکتہ ملحوظ رہنا چاہیے کہ ہم اس گھپلے یا مغالطے کے قائل نہیں ہیں کہ کسی نظام کو اپنانے کی ایک ہی صورت ہے جو یہ ہے کہ جب بھی ہم کسی تصور حیات کو اپنائیں۔ پورا پورا اپنائیں۔ یعنی اس کی تمام جزئیات کو مانیں اور تمام لوازم کو تسلیم کریں۔ ورنہ پورے نظام کو مسترد کر دیں۔ ان لوگوں کے نزدیک یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی نظام کے بعض حصص کو مانیں بعض کو نہ مانیں۔ جو لوگ اس سفسطہ کا شکار ہیں ان کے نزدیک بیچ کی کوئی راہ نہیں۔ ہم سمجھتے ہیں اس نوع کی خطیبانہ باتیں صرف وہ لوگ پیش کرتے ہیں جن کی نظر تہذیب و تمدن کی تاریخ پر گہری نہیں۔ تہذیب و تمدن کی منطق اپنی ہے اس میں جب بھی کوئی تغیر رونما ہوا ہے۔ کچھ لو، کچھ دو (Give-and-Take) کے ہمہ گیر اصول کی بنا پر ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے آج تک کسی تہذیب نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اخذ و عطا کے اس اصول سے قطع نظر کر کے کامل قبول یا کامل استرداد کے نظریہ پر عمل نہیں کیا، بلکہ ہوا یہ ہے کہ ہر تہذیب دوسری تہذیب سے جزوی طور پر متاثر ہوئی ہے اور اس جزوی تاثر کی بنا پر اس کے رنگ و روغن، اس کے چہرہ مہرہ میں نئی تازگی اور نیا نکھار ابھرا ہے لیکن اس کے باوجود اس نے اپنی تہذیبی انفرادیت بہر حال قائم رکھی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکی نظام کی مصطلحات کو سرے دست چھوڑ دیجیے ہم جو چاہتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ ہم اپنے نظام اقتصادی کے نقشوں کو کچھ اس طرح ترتیب دیں کہ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم رک جائے اور استحصال کو کلیتہً ختم کر دیا جائے۔ ہم ایسا اسلوب حیات چاہتے ہیں جس میں فرد آزاد ہو، اور اس کے لیے ترقی کی تمام راہیں کھلی ہوں۔ انسان کی قدر و منزلت اس کی معنوی خوبیوں کے لحاظ سے متعین ہو۔ دولت اور زر کے لحاظ سے نہیں۔ ہمارے نزدیک اسلامی معاشرہ کے معنی ایک ایسے معاشرہ کی تعمیر کے ہیں جس میں ایک عام آدمی کا اشکال یہ نہ ہو کہ اسے آذوقہ حیات کیونکر بہم پہنچانا ہے، اور کشاکش روزگار سے کیونکر نجات حاصل کرنا ہے۔ بلکہ اس کے برعکس یہ ہو کہ اپنی ذہنی صلاحیتوں کو کیونکر بروے کار لانا ہے۔ کیونکر اپنی علمی خامیوں کو دور کرنا اور علوم و فنون میں بڑھنا ہے۔ کیونکر ایک اچھا سائنسدان، اچھا فلسفی اور اچھا طبیب یا انجینئر بننا ہے۔ سیرت و کردار کو کیونکر چمکانا ہے اور مذہب و دین کے لطائف کو کس طرح روزمرہ کی زندگی میں سمونا ہے۔ یا کس طریق سے ملت و ملک کی زیادہ سے زیادہ خدمت بجالانا ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا اسلام اس طرح کے معاشرہ کی تخلیق و پرورش میں ہماری رہنمائی کرتا ہے؟ اور اگر جواب اثبات میں ہے، اور یقیناً اثبات میں ہے تو دوسرا سوال فکر و نظر کے سامنے یہ آئے گا کہ اس کے لیے ہمارے اقتصادی نظام میں کیا کیا متعین تبدیلیاں ضروری ہیں اور وہ کیا مثبت اقدامات ہیں جن کو اس سلسلہ میں بروئے کار لانا چاہیے؟

بحث و تمحیص کے اس اسلوب سے اتنی بات تو بہر حال واضح ہو گئی ہو گی کہ زمانے کے تغیر و انقلاب نے عقائد و اعمال کے پورے نقشے کو بدل کر رکھ دیا ہے اور ایسے ایسے نئے مسائل پیدا کر دیے ہیں کہ اگر ہم نے ان کو مجتہدانہ طور پر حل نہ کیا اور بغیر کسی مرعوبیت کے ان کے مقابلہ میں اسلامی تہذیب و تمدن کے موقف کو متعین کرنے میں تساہل سے کام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یا تو دو خطروں میں سے ایک کو قبول کرنے کے لیے ہمیں تیار رہنا چاہیے۔ یا تو ہم دنیا سے الگ تھلگ مذہب کے نام سے ایک ایسے مجموعۂ افکار کو سینے سے چپکائے رکھیں گے جو ٹھس بے جان اور بے کیف ہے۔ جو زندگی اور اس کی طرفگی سے محروم ہے، اور یا پھر ہمیں اپنی انفرادیت کھو کر عصر حاضر کے طوفان خیز تھپیڑوں کا شکار ہو کر رہ جانا ہو گا۔

خدا کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں جو دین عطا کیا ہے اس میں کافی لوچ اور لچک ہے یعنی اس میں فکر و اجتہاد کی تازہ کاریوں کی گنجائش ہے۔ اگر ہم اپنے اس حق کو استعمال کریں تو ہم نہ صرف ان دو خطروں سے اچھی طرح نمٹ سکتے ہیں بلکہ اپنے دینی تصورات کو نئی آب و تاب اور نئی سج دھج کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش بھی کر سکتے ہیں۔

غور طلب نکتہ صرف یہ ہے کہ اجتہاد کا یہ حق کیا ہے، اس کے حدود کیا ہیں اور موجودہ دور میں اس کے استعمال کا صحیح اور مفید اسلوب کیا ہے؟

ہماری رائے میں اس ضمن میں تین باتیں خصوصیت سے شائستۂ التفات ہیں،

۱۔ یہ کہ فکر و اجتہاد کی کارفرمائیوں کو صرف فقہیات تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ اس کے دائرہ میں عقائد اور مابعد الطبیعیات کو بھی شامل کیا جائے۔ کیونکہ اس وقت اشکال کی جو نوعیت ہے وہ یہ ہے کہ تہذیب و تمدن کے علاوہ عقائد کی دنیا میں بھی عظیم انقلاب رونما ہوا ہے اور نقد و عمل کے علاوہ دلائل و براہین کے انداز میں بھی اس دور میں بنیادی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ دونوں پہلوؤں پر بیک وقت غور کیا جائے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ فقہ یا تہذیبی مسائل اور مابعد الطبیعیات میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اگر کسی قوم کے عقائد صحیح ہیں۔ تصورات صحت مند اور درست ہیں تو اس پر مبنی زندگی کا نقشہ بھی معقول ہو گا۔ اور اگر عقائد و فکر میں جھول ہو گا تو اسی نسبت سے زندگی میں بھی جھول پایا جائے گا۔

۲۔ یہ کہ فکر و اجتہاد کے فریضہ سے عہدہ برا ہونے کے لیے ایسی جماعت کا انتخاب کیا جائے جس میں ایک طرف تو چوٹی کے سمجھے ہوئے اور روشن ضمیر علما ہوں اور ان کے ساتھ ماہرین قانون، ماہرین عمرانیات اور گہرا فلسفیانہ ذوق رکھنے والے ایسے حضرات ہوں جو احیائے اسلام کے لیے دل میں تڑپ اور ولولہ رکھتے ہوں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اجتہاد کے لیے ایک جماعت کا انتخاب ہمارے نزدیک اس بنا پر ضروری ہے کہ آج کسی مسئلہ کو طے کرنے کا سائنٹیفک طریق یہ نہیں کہ اس پر صرف ایک پہلو اور ایک زاویہ نظر سے غور و فکر کو کافی سمجھا جائے بلکہ یہ ضروری ہے کہ اس کے جملہ پہلوؤں کو نظر و فکر کا ہدف ٹھہرایا جائے۔ یعنی اس سلسلہ میں علوم و فنون کے ان تمام نتائج و مسلمات سے استفادہ کرنا چاہیے کہ جو زیر بحث مسئلہ پر روشنی ڈال سکیں۔

۳۔ اجتہاد کے حدود کیا ہوں؟ ہماری ناچیز رائے میں اس مسئلہ پر بھی اہل فکر کی اس مجلس میں دوبارہ غور ہونا چاہیے۔ اور خود اجتہاد و فکر ہی کو اساس ٹھہرا کر یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ اس انقلابی دور میں جب کہ قدریں بدل گئی ہیں، پرانی بنیادیں ہل گئی ہیں اور عقائد سے لے کر عمل تک ہر شے ایک طرح کے انقلاب سے دوچار ہے، مسئلہ اجتہاد کی تگ و تاز کے حدود کہاں سے کہاں تک وسعت پذیر ہونا چاہئیں۔ اس لیے کہ یہ بات طے کیے بغیر ہم اسلام کی ایسی کھلی ہوئی تعبیر پیش نہیں کر سکتے جو اس کو زندہ، متحرک اور ترقی پذیر تہذیب کے روپ میں ظاہر کر سکے۔

تعلیماتِ غزالی

(از مولانا محمد حنیف ندوی)

امام غزالی نے اپنی بے نظیر تصنیف "احیاء" میں یہ واضح کیا ہے کہ اسلام و شریعت نے انسانی زندگی کے لیے جو لائحہ عمل پیش کیا ہے اس کی تہہ میں کیا فلسفہ کارفرما ہے۔ یہ کتاب انہی مطالب کی آزاد اور توضیحی تلخیص ہے اور اس کے مقدمہ میں تصوف کے رموز و نکات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ قیمت ۱۰ روپے

ملنے کا پتہ: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

© rasailojaraid.com